ہونے ایک موقع پر کہا تھا کہ مجھے اسلام پسندوں سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ اسلام نے عورت کو قتل کرنے سے منع کیا ہے۔ مگر افسوس کہ اسلام کے ایسے اعلانِ اصول کی موجودگی میں غالباً کسی دینی جہالت کے سبب وہ سب کچھ ہوگیا، جو بے نظیر کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا یعنی محترمہ پر بے رحمانہ حملہ کردیا گیا جسکے نتیجے میں وہ اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ اس "شہادت پرست مسلم" کو خون کے آنسو رونا چاہیے کیونکہ یہ شہادت دراصل ایک "اسلامی اصول" کی شہادت بھی ہے۔

آہ! جسٹس عبادت یار خان مرحوم

سندھ ہائیکورٹ کے ریٹائرڈ جسٹس عبادت یار خان پچھلے دنوں بیاسی سال کی عمر میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ انہیں پی ای سی ایچ ایس کے قبرستان میں سپردِ خاک کردیا گیا۔ مرحوم جولائی ۱۹۲۵ کو رام پور (انڈیا) میں پیدا ہوئے ۱۹۴۷ میں وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اسٹوڈنٹس یونین کے صدر رہے اور طالب علم رہنما کی حیثیت سے قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں حصہ لیا۔ وہ اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن اور وفاقی شرعی عدالت کے جج بھی رہے اور جامعہ کراچی میں سنڈیکیٹ اور سلیکشن بورڈ کے ممبر بھی۔ وہ ایک بااصول دیانتدار، سچے اور کھرے انسان کی حیثیت سے معروف تھے۔

جامعہ کراچی میں راقم کی بحیثیت لیکچرر شعبہ علوم اسلامیہ تقرری جس سلیکشن بورڈ کے فیصلے کے تحت عمل میں آئی تھی جسٹس عبادت یار خاں مرحوم اس کے ممبر تھے۔ میرے انٹرویو میں انہوں نے مجھ سے متعدد سوالات کیئے تھے۔ اور میرے جوابات سے وہ اس قدر خوش تھے کہ پروفیسر ڈاکٹر اختر سعید صدیقی (سابق ڈین کلیۂ معارف اسلامیہ) کے بقول سب سے بڑھ کر میرے انتخاب اور تقرری کی سفارش بھی مرحوم نے ہی کی تھی۔ واضح رہے کہ میں ان سے زندگی میں کبھی نہیں ملا۔ نہ اس دن سے پہلے اور نہ اس کے بعد۔ میری تقرری کے لئے ان کی یہ سفارش یقیناً میرٹ کے مطابق ہوگی ورنہ وہ ہرگز نہ کرتے۔ اور یہی ان کی وہ خوبی تھی کہ جس نے مجھ پر خوشگوار اثرات مرتب کئے۔ ان کی یہ سفارش میری زندگی کا ناقابلِ فراموش باب ہے۔ ان کی وفات کی خبر جہاں عدالتی اور دیگر قومی حلقوں میں رنج کا باعث بنی وہیں میری ذاتی زندگی میں بھی کبھی نہ بھولنے والا لمحہ ثابت ہوئی ہے خدا مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ (آمین)

(مدیرِ اعلیٰ)

حلالہ مروجہ اور قرآنی حلالہ کے درمیان فرق

پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد شکیل اوج

شعبہ علوم اسلامیہ، جامعہ کراچی

عارضی نکاح کو حلالہ کہتے ہیں بشرطیکہ طلاق کو نکاح کی شرط نہ بنایا جائے، تاہم بوقتِ نکاح طلاق کا قصد وارادہ ہو تو کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا، اس نکاح میں اول الذکر شکل کو ناجائز اور گناہ جبکہ موخر الذکر صورت کو جائز وروا قرار دیا جاتا ہے، شرط وقصد کی تفصیل فقہی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے، مسئلہ زیرِ بحث یہ ہے کہ قرآن مجید نے فلا تحل لہ حتی تنکح زوجا غیرہ (البقرہ) کے الفاظ میں جس نکاح کی بات کی ہے، وہ کون سا نکاح ہے مروجہ حلالہ یا تحلیل شرعی۔

ہم سمجھتے ہیں کہ فقہی حلالہ قرآنی حلالہ سے بالکل الگ اور مختلف چیز ہے مگر افسوس کہ ہمارے غیر تحقیقی رویے اور قرآن سے ہمارے عدمِ تعلق اور عدمِ غور وفکر کے باعث قرآنی حلالہ، فقہی حلالہ میں گم ہوچکا ہے، زیرِ نظر مضمون میں اسی متاعِ گم شدہ کی تلاش جستجو ہمارا مقصد ہے، اس سلسلے میں ہمیں چند باتوں پر غور کرنا ہوگا:

۱۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن مجید کی رو سے نکاح کبھی عارضی نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ دائمی ہوتا ہے، اسی لئے تو "طلاق" کا قانون بنایا گیا ہے کہ اگر میاں بیوی کے درمیان کوئی ناقابلِ اصلاح نقص پیدا ہوگیا ہو تو اسے طلاق کے ذریعے ختم کیا جاسکے لیکن اگر شرطِ طلاق یا پھر قصدِ طلاق کے ساتھ نکاح منعقد ہوتا بتایا جائے کہ اپنے انجام کے اعتبار سے دونوں میں کیا جوہری فرق رہ جاتا ہے؟ مگر حیرت ہے کہ ہمارے فقہا نے قصدِ طلاق کے ساتھ ایسے نکاح کو نہ صرف جائز قرار دیا ہے بلکہ اسے باعثِ اجر وثواب بھی گردانا ہے۔ (۱)

لیکن ہمارے نزدیک کسی نکاح میں اگر احصان کا معنی نہ پایا جائے تو اسے از روئے قرآن نکاح کہنا محلِ نظر ہوگا، احصان، حصن سے بنا ہے اور حصن قلعہ کو کہتے ہیں، یعنی ایسی جگہ جو لوگوں کے لئے حفاظت کا کام انجام دے، شادی شدہ مرد کو محصن اور شادی شدہ عورت کو محصنہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ نکاح کے ذریعے وہ ایک دوسرے کو حفاظتِ نفس فراہم کرتے ہیں، گویا دونوں ایک قلعہ میں محفوظ ہوجاتے ہیں،

مرد بہ ذریعہ نکاح عورت کو اپنے حصن (حفاظت وحمایت) میں لے لیتا ہے، اس طرح عورت کی عفت و عصمت محفوظ ہو جاتی ہے اور خود مرد کی بے قابو جنسی خواہش کو بھی لگام لگ جاتی ہے، یوں وہ خود بھی نکاح کے حصار میں محفوظ ہو جاتا ہے، قرآن نے مرد کو محصن اور عورت کو محصنہ کہہ کر دراصل اسی حقیقت کی تذکیر کی ہے۔

محصنین کے لفظ کے ساتھ غیر مسافحین و لا متخذی اخدانٍ کے الفاظ اس لئے استعمال ہوئے ہیں، تاکہ معلوم ہو کہ شارع نے اپنے ماننے والوں کے لئے احصان سے ہٹ کر کھلے بندوں یا چوری چھپے ہر دو طریق سے قائم جنسی تعلقات پر پابندی عائد کر رکھی ہے۔ آپ قرآن مجید کے ان الفاظ کو پیش نظر رکھیے محصنین غیر مسافحین و لامتخذی اخدانٍ اور غور و خوض کے بعد انصافاً کہیے کہ کیا مروجہ حلالہ، محصنین کی تعریف میں آتا ہے؟ یعنی کیا یہ حلالہ مرد کو عورت کی عزت و آبرو کا محافظ و امین بناتا ہے؟ یا اس کے برعکس عورت کی عزت و ناموس کو لوٹنے والا جس کی مدت عام طور پر دو ایک راتوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ نکاح میں مرد و عورت کی باہمی رضامندی بنیادی عامل کا کردار ادا کرتی ہے اور اس رضامندی کی اہمیت بلکہ ضرورت کا کوئی بھی منکر نہیں ہے تو اب سوال یہ ہے کہ کیا مروجہ حلالہ میں بھی فریقین کی آزادانہ مرضی کا کوئی عمل دخل ہوتا ہے؟

۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ حلالہ کرتے وقت استقرار حمل کی صورت میں آئندہ کے لائحہ عمل کا کوئی شرعی منصوبہ مرد یا عورت کے ذہن میں ہوتا ہے؟ اور نکاح حلالہ کے دوران اگر کوئی فریق فوت ہو جائے تو کیا حقوق وراثت پیدا ہونے کا مسئلہ بھی کسی فریق کے ذہن میں ہوتا ہے؟ آپ کو ان سوالوں کا جواب شاید اثبات میں نہ ملے، جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ حلالہ خالصتاً عارضی ہوتا ہے جو ہنگامی صورت حال میں وجود پذیر ہوتا ہے اور یہ کہ حلالہ کی "دائمی نکاح" کی طرح کوئی بنیاد نہیں ہوتی گویا یہ وہ بیج ہے جو درخت پیدا کرنے کیلئے نہیں بویا جاتا۔

۴۔ چوتھے یہ کہ مرد و عورت جب رشتہ ازدواج میں بندھ رہے ہوتے ہیں تو فریقین کے متعلقین ایک دوسرے کی معاشی، اخلاقی اور مذہبی حالات کی جانچ پڑتال اور چھان پھٹک میں مصروف ہو جاتے ہیں، پھر لمبی چوڑی تحقیق و تفتیش کے بعد نکاح کا مقدس رشتہ وجود میں آتا ہے، کیا حلالہ بھی اپنے پس منظر میں کسی ایسی ہی انکوائری کا طلب گار ہوتا ہے؟ اپنے ضمیر کی عدالت سے پوچھئے اگر وہ حلالہ کو

قرآن کا مطلوب نکاح قرار دے تو بے شک اسے اختیار کر لیجئے وگرنہ خدارا اس غیر شرعی اور غیر قرآنی عمل کو تحلیل شرعی کا نام نہ دیجئے۔

غیر مسافحین و لا متخذی اخدانٍ سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن نے نکاح کو جہاں احصان سے تعبیر کیا ہے وہیں ان لفظوں سے نکاح کے مفہوم کا کامل احاطہ بھی کر لیا ہے، یعنی نکاح ایسا ہو کہ جو مسافحت کا غیر ہو اور مسافحت کا غیر وہی ہو سکتا ہے، جس میں احصان کا قصد ہو اور جو نکاح قصد احصان سے خالی ہو، وہ مسافحت کا غیر نہیں بلکہ اس کا عین ہے جو لوگ نکاح کی غرض و غایت، فقط جنسی ملاپ کو قرار دیتے ہیں، انہیں اس آیت پر غور کرنا چاہیے، سچ کہئے کیا مروجہ حلالہ مرد و عورت کے درمیان فقط شہوت رانی اور جنسی تعلقات سے عبارت نہیں ہے؟ اور کیا ایسے نکاح میں دوران حلالہ علی الاعلان اور طلاق کے بعد چوری چھپے جنسی رابطے کا امکان نہیں ہے؟ کوئی ہے جو اس پر غور کرے؟

اس لئے کہ جنسی بے راہ روی صرف مرد میں نہیں ہوتی، عورت میں بھی ہوتی ہے، حلالہ کی صورت میں اگر ایک بار ہی سہی کسی عورت نے اپنے محلل کا ذائقہ چکھ لیا اور اسے مزہ آ گیا تو کیا طلاق کے بعد وہ دوبارہ اسی محلل سے جنسی رابطہ بحال رکھنے کی خواہش مند نہیں ہو سکتی؟ کیوں کہ جس طرح محصنین غیر مسافحین و لا متخذی اخدانٍ کے الفاظ مرد کے تعلق سے آئے ہیں، اسی طرح محصنات غیر مسافحات ولا متخذات اخدان (النساء: ۲۵) کے الفاظ عورت کے تعلق سے بھی آئے ہیں، مطلب یہ کہ عورتیں بھی محصنہ بننے کیلئے قید نکاح میں آئیں، کھلے بندوں شہوت رانیاں اور خفیہ آشنائیاں کرنے والی نہ بنیں، ہم سمجھتے ہیں کہ حلالہ جہاں ایک طرف کھلے بندوں اور علی الاعلان (بصورت نکاح) شہوت رانی کا ذریعہ بنتا ہے، وہیں چوری چھپے (بصورت طلاق) جنسی ملاپ کی سبیل بھی پیدا کر دیتا ہے۔

ہمارے نزدیک اس قرآنی فقرہ میں معانی کا ایک جہان سمٹا ہوا ہے، اس فقرہ میں نکاح کی ایسی تعریف کی گئی ہے جس کی رو سے صرف متعہ ہی حرام نہیں ٹھہرتا بلکہ مروجہ حلالہ بھی حرام ٹھہرتا ہے کیوں کہ یہ دونوں ہی احصان کی صفت سے خالی اور مسافحت کی شناختوں سے پر ہیں۔

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا تھا: "الا اخبرکم بالتیس المستعار" تو انہوں نے پوچھا: "من ھو یا رسول اللہ؟" آپ ﷺ نے فرمایا: ھو المحلل، لعن اللہ المحلل والمحلل لہ"۔ (۲)

سید محمود آلوسیؒ نے حلالہ کے تعلق سے حسب ذیل دو روایات نقل کی ہیں:

۱۔ عبدالرزاق نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ لا اوتی بمحلل ولا محلل له الا رجمتهما۔ میرے پاس کوئی حلالہ کرنے والا اور کرانے والا لایا گیا تو میں ضرور ان دونوں کو رجم کردوں گا۔

۲۔ بیہقی میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے تعلق سے یہ روایت آئی ہے رفع اليه رجل متزوج امراة ليحلها لزوجها ففرق بينهما وقال لا ترجع اليه الا بنكاح رغبة غير دلسة۔ یعنی ایک ایسا مقدمہ ان کے سامنے پیش ہوا جس میں ایک شخص نے کسی عورت سے اس کے سابق شوہر کے لئے حلالہ کے طور پر نکاح کیا تھا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے فیصلہ سے ان دونوں کو الگ کردیا اور فرمایا کہ وہ عورت اپنے پہلے خاوند سے رجوع نہیں کرسکتی، تاوقتیکہ اپنا مرغوب نکاح نہ کرے، یعنی ایسا نکاح جو (مروجہ حلالہ کی) ملاوٹ سے پاک ہو۔ (۳)

آپ نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے حلالہ کو ملعون قرار دیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے قابل رجم فعل گردانا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے وصف نکاح سے مجرد مانا ہے، ایسی صورت میں ان قطعی روایتوں کے باوجود مروجہ حلالہ پر اصرار نا قابل فہم ہے۔

پیر محمد کرم شاہ الازہری نے فان طلقها فلا تحل له حتى تنكح زوجا غيره کی جو تفسیر کی ہے، اس میں بھی حلالہ مروجہ کا رد موجود ہے، اسے بھی ایک نظر دیکھ لیجئے، فرماتے ہیں:

"یہاں سے تیسری طلاق اور اس کے حکم کا بیان ہے (۴) یعنی اگر تیسری طلاق بھی اس نے دے دی تو اب جب تک وہ کسی دوسرے خاوند سے بالکل اس طرح بسنے کی نیت سے نکاح نہ کرے، جیسے اس نے پہلے خاوند کے ساتھ کیا تھا اور پھر وہ دوسرا خاوند ہم بستری کرنے کے بعد بمدت گزرنے پر اپنی مرضی سے اسے طلاق نہ دے دے، اس وقت تک وہ پہلے خاوند کے نکاح میں نہیں جا سکتی، یہ ہے قرآن کریم کا واضح ارشاد، جس میں تاویل کی گنجائش نہیں، آج کل اس کا حل حلالہ کی باعث صد نفرین صورت میں تلاش کرلیا گیا ہے، اس کے متعلق حضور نبی کریم ﷺ کا یہ حکم پیش نظر رہے، لعن الله المحلل والمحلل له، ترجمہ: حلالہ کرنے والے پر بھی اللہ کی پھٹکار اور جس (بے غیرت) کے لئے حلالہ کیا جا رہا ہے اس پر بھی اللہ کی پھٹکار"۔ (۵)

فان طلقها فلا تحل له حتى تنكح زوجا غيره میں جس تحلیل شرعی کا بیان ہے، وہ عرفاً وہی ہے جو آپ نے پیر صاحب کے حوالہ سے اوپر ملاحظہ کیا، جسے میں اپنے لفظوں میں کچھ اس طرح

بیان کروں گا کہ قرآنی حلالہ وہ ہے کہ جس میں بوقت نکاح شرط طلاق پائی جائے نہ قصد طلاق، فریقین کی باہمی رضامندی سے زندگی بھر کے تمتع کے ارادہ سے وہ عورت کسی اور سے نکاح کرلے، پھر اگر قدرتی طور پر وہ نکاح کامیاب نہ ہوسکے اور طلاق واقع ہوجائے یا اس عورت کا دوسرا شوہر جہان فانی سے ہی رخصت ہوجائے تو اس صورت میں وہ عورت اپنے شوہر کے لئے بہ غرض نکاح حلال ہوجائے گی۔

غرض اس تحلیل شرعی میں کوئی سازش اور کوئی خفیہ ہاتھ ایسا نہیں ہے کہ جو عورت کے لئے اس کے پہلے شوہر کو حلال کرنے کیلئے استعمال میں آیا ہو، یہ جو کچھ بھی ہوا محض اتفاق تھا اور بالکل فطری طور پر واقع ہوا، اسی اتفاق اور فطرت کے حسین امتزاج کو قرآنی حلالہ کہا جاتا ہے اور قرآن نے فلا تحل له حتى تنكح زوجا غيره والی آیت میں اسی حلالہ کو بیان

حواشی وحوالہ جات

(۱) درمختار، باب الرجعة، مطبع مجتبائی دہلی، ۱/۲۴۱، بحوالہ فتاوی رضویہ، جلد ۱۲، ص ۴۰۹، رضا فاؤنڈیشن، جامع نظامیہ رضویہ، اندرون لوہاری دروازہ نمبر ۸، پاکستان (۵۴۰۰۰)

(۲) اخرجہ ابن ماجہ والحاکم وصححہ والبیہقی، بحوالہ روح المعانی، الجزء الثانی، ص ۱۴۱، علامہ سید محمود آلوسی، مکتبہ امدادیہ، ملتان، سنہ اشاعت درج نہیں۔

(۳) روح المعانی، الجزء الثانی، ص ۱۴۲۔

(۴) یہاں حلالہ کے تعلق سے، راقم ایک بات عرض کرنا چاہے گا: ہمارے اکثر مشہور بلکہ تمام فقہا مردوں سے طلاق مغلظہ پانے والی عورتوں کو اسی کا مصداق قرار دیتے ہیں، جب کہ علامہ تمنا عمادی اور علامہ جعفر شاہ پھلواروی اس تحلیل شرعی کا حکم صرف اس عورت کے لئے مانتے ہیں۔ جس نے اپنے شوہر سے بعوض مال اپنی مرضی سے طلاق حاصل کی ہو، نہ کہ وہ عورت کہ جسے شوہر نے از خود اپنی مرضی سے طلاق دی ہو۔ جعفر شاہ پھلواروی کے الفاظ میں "مختلعہ ثانی کے بعد اگر شوہر ثانی بھی اتفاقیہ طلاق دے دے تو پہلے شوہر کے لئے حلال ہوجاتی ہے، یہ حکم تھا تو صرف خلع لینے والی عورت کیلئے لیکن یہ سمجھا گیا کہ تین طلاق پانے والی عورت کے لئے"۔ (قرآنی قانون طلاق، ص ۳۵، ادارہ کبیر، رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، تاریخ اشاعت ۲۰۰۳ء) تفصیل کے طالبین ان دونوں محترم اور بزرگ محققین کی کتابوں کا مطالعہ فرمائیں، الطلاق مرتان، ۱۲۷ صفحات پر مشتمل علامہ تمنا عمادی کی شہرۂ آفاق کتاب ہے، میرے پاس دوست ایسوسی ایٹس اردو بازار، لاہور کا وہ نسخہ ہے، جو ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا اور جعفر شاہ صاحب کی کتاب ۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۵) ضیاء القرآن، جلد اول، حاشیہ زیر آیت نمبر ۲۳۰، سورۃ بقرہ، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، گنج بخش روڈ، لاہور، سنہ اشاعت درج نہیں۔

(بشکریہ ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، جون ۲۰۰۷ء)

کتابی مرد و عورت کا مسلم مرد و عورت سے نکاح

علامہ محمد جعفر شاہ پھلواری

والمحصنت من المؤمنت والمحصنت من الذین اوتوا الکتب من قبلکم ـــــ الخ (5:5)

تمہارے لئے پاکباز مومنہ اور پاکباز کتابیہ سے نکاح جائز ہے۔

یہاں زن و مرد کا یہ فرق عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ مومن مرد کو تو کتابیہ عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت ہے لیکن مومنہ عورت کو کتابی مرد سے نکاح کی اجازت نہیں۔ بظاہر یہی کہا جائے گا کہ اس میں صنفِ قوی کی قوت کی رعایت ہے اور جنسِ ضعیف کے ضعف کی رعایت نہیں۔ لیکن اس حکم میں دراصل ضعیف ہی کی رعایت ملحوظ ہے۔ حقیقت یوں ہے کہ اہل کتاب کے نظامِ زندگی کی دو حیثیتیں ہیں۔ اس کا ایک حصہ وہ ہے جو انہیں آسمانی کتاب کے ذریعے ملا ہے اور دوسرا وہ جو اہل کتاب کے معاشرے نے اپنی کتابی ہدایات کی روشنی میں یا اس سے الگ ہو کر بنایا ہے۔ جہاں تک کتاب کا تعلق ہے وہاں عورتوں کے لئے ایک حق بھی ان حقوق جیسے نہیں جو اسلام نے دیے ہیں۔ رہا معاشرے کے اپنے بنائے ہوئے حقوق تو ان کا یہ حال ہے کہ تھوڑا عرصہ پہلے تک یورپ میں عورت کی کوئی مستقل ہستی تھی ہی نہیں۔ شادی ہوتے ہی تمام ملکیتیں شوہر کی ملک ہو جاتی تھیں۔ اس سے زیادہ ترقی کی تو یہ کہ زن و شوہر مل کر ایک وحدت ہو جاتے ہیں جس کے معنی یہ ہوئے کہ یا تو عورت اپنے شوہر میں مدغم ہو گئی یا مرد اپنی بیوی میں تحلیل ہو گیا۔ یا پھر دونوں کی اپنی مستقل ہستی ختم ہو گئی اور دونوں مل کر ایک ایسی وحدت ہو گئے کہ اگر ایک جدا ہو تو دوسرا آدھا رہ گیا۔ اس طرح کی ترقی بھی عیسائی عقیدے (DOGMA) سے کم نہیں۔ اسی طرح عورت اگر اپنی سو (100) وجوہ ناپسندیدگی کے ہوتے ہوئے بھی اپنے شوہر سے جدا ہونا چاہے تو نہیں ہو سکتی تا آں کہ اسے زانی نہ ثابت کر دے۔ فرمایئے ایک مومنہ کے لئے اپنے تمام اسلامی حقوق سے دستبردار ہو کر ایک ایسی سوسائٹی میں جانا جہاں اس کے لئے نہ کوئی حق ہو نہ اپنی مستقل انفرادیت، کون سی عقلمندی ہو گی اور اجازت اس کے لئے کس رعایت و تدبر کا سامان ہو گا؟ بخلاف اس کے اگر کوئی کتابیہ عورت کسی مرد مومن سے نکاح کرتی ہے تو اسے اس نئی سوسائٹی میں آ کر وہ تمام حقوق مل جاتے ہیں جن کا

وہ اپنی سوسائٹی میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ پس یہ قانون جنسِ ضعیف کے حق خود اختیاری کا غصب نہیں بلکہ اس کے حقوق کی کمال حفاظت ہے۔ یہ قانون ایک طرف زن مومنہ کے حقوق کو سلب ہونے سے بچاتا ہے اور دوسری جانب زن کتابیہ کے لئے حصولِ حقوق کا راستہ کھولتا ہے۔ اسلام صرف نساء مومنات ہی کا دستگیر نہیں بلکہ اس پوری جنسِ ضعیف کا دستگیر ہے خواہ وہ کتابیہ ہی کیوں نہ ہو۔ رہا مشرکہ عورتوں کا معاملہ تو ہم آگے چل کر گفتگو کریں گے۔

کتابی و کتابیہ کی مساوات کا سوال

پہلے ایک اور نازک مسئلے کو حل کرتے چلیے۔ سوال یہ ہے کہ

(1) یہ حکم اقدار مستقلہ کی حیثیت رکھتا ہے جس میں کوئی تغیر نہ ہو سکے؟ یا یہ ایک عبوری قانون ہے؟

(2) کیا کوئی دور ایسا بھی آ سکتا ہے جس میں مرد مومن کا نکاح کتابیہ سے ناجائز یا زن مومنہ کا نکاح اہل کتاب سے جائز قرار دیا جائے؟

یہ دونوں سوال دراصل ایک ہی شے کے دو رخ ہیں اور کسی ایک کا جواب خود بخود دوسرے کا بھی جواب بن جاتا ہے۔ بہرکیف یہ بحث چونکہ ہماری کتاب کا ایک مرکزی مضمون ہے اس لئے ہم ذرا تفصیل سے اس پر روشنی ڈالیں گے کیونکہ آگے آنے والے مضامین سے بھی اس کا گہرا تعلق ہر جگہ قائم ہے۔ پہلے سوال کا جواب مولانا رومی کے یہ شعر ہیں:

چہ غم ار غواص را پاچیلہ نیست   اندرون کعبہ رسم قبلہ نیست
تا لب بحر این نشان و نقش پاست   چوں بہ بحر آئی نشان پا کجاست

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان جب تک خشکی پر چلتا رہتا ہے اسے جوتے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جب پانی میں گھسنا چاہتا ہے تو اپنے جوتے اتار لیتا ہے۔ اور اس کی مثال یہ ہے کہ جب تک انسان کعبے سے باہر ہے اسے نماز کے لئے ایک ایسی سمت متعین کرنی پڑتی ہے جس کا رخ کعبے کی طرف ہو لیکن کعبے کے اندر پہنچنے کے بعد سمت قبلہ اختیار کرنے کی پابندی ختم ہو جاتی ہے۔ وہ جدھر چاہے رخ کر کے نماز ادا کر لیتا ہے اس لئے کہ اس وقت وہ کعبے کی گود میں ہوتا ہے۔ نقشِ پا کا سوال پانی کے کنارے ہی تک ہے۔ پانی میں جانے کے بعد نشانِ پا کا سوال ختم ہو جاتا ہے۔

انسان ذہنی و عملی اعتبار سے بھی دو مختلف طبقوں میں منقسم ہے۔ قرآن پاک نے ان سب کے

لئے جہاں مشترک اصول دیئے ہیں وہاں مختلف سطح کے انسانوں کے لئے کچھ مختلف احکام بھی دیئے ہیں۔ ان کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی طبقہ کو ہمیشہ اسی سطح پر قائم رکھنا چاہتا ہے جس پر وہ بوقت تخاطب قائم ہے بلکہ اس کی غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ اس کے ذریعے سے آگے بڑھ کر اونچی سطح پر آجائے۔ اس وقت وہ احکام جو نچلی سطح کے لئے تھے خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ اس طرح انسان لامحدود ارتقاء کی طرف مسلسل بڑھتا چلا جائے گا۔ جس وقت انسان پست سطح پر ہوتا ہے اس وقت کی عطا کردہ "قدریں" اس کے لئے قدریں ہی ہوتی ہیں لیکن دراصل وہ کسی دوسری اعلیٰ قدر کے لئے زینہ اور وسیلہ ہوتی ہیں۔ قرآن پاک نے صرف یہی نہیں کیا ہے کہ اعلیٰ ترین اقدار حیات دے کر بات ختم کر دی ہو بلکہ معذور و کمزور انسانی مخلوق کے لئے ایسی اقدار بھی تجویز کر دی ہیں جو اگرچہ اصل اقدار حیات کے مقابلے میں پست معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن وہی اس ضعیف مخلوق کے لئے مختلف گوشوں میں سہارا بنتی ہیں اور مرکزی اقدار تک لے جانے کے لئے ذریعہ و وسیلہ کا کام دیتی ہیں۔ ان فرعی اقدار کو اصلی اقدار کی طرح غیر متبدل شمار کر لینا صحیح نہیں۔ ہماری اس گفتگو سے یقیناً وہ لوگ جو احادیث کی جزئیات اور فقہ کی فروع تک کو اقدار مستقلہ اور غیر متبدل حقیقت سمجھتے ہیں، ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جائیں گے۔ ہمیں ان کی اس مجبوری و معذوری کا پورا پورا احساس ہے۔ اس لئے کہ ہم خود عرصہ دراز تک اس دور سے گزرتے رہے ہیں۔ لیکن کسی حقیقت کو عیاناً دیکھ چکنے کے بعد اسے خفا کے پردوں میں زیادہ دیر تک مستور رکھنا ہمارے لئے مشکل ہے۔

ہمارے اس بیان سے یہ شبہ پیدا ہونا ممکن ہے کہ اس سے ایک حصہ تحریر آن پاک کی "ابدیت" خطرے میں پڑ جائے گی۔ لیکن یہ بات کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ مستقل اور مرکزی اقدار اور ان کی طرف ارتقاء کا خطرے میں پڑ جانا عارضی اقدار کے خطرے میں پڑنے سے زیادہ برا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی سوچنا چاہیے کہ نچلی اقدار کا کسی کو اعلیٰ اقدار تک پہنچا کر خود ختم ہو جانا ان کی عین کامیابی ہے اور یہی عین مقصود ہے۔ ان کی ابدیت یہ نہیں کہ ہر زمان و مکان میں علی حالہا باقی رہیں۔ بلکہ ان کی ابدیت کی نوعیت ہی یہ ہے کہ جب تک ایک خاص سطح کے انسان وجود میں آتے رہیں یہ ان کو سہارا دے کر آگے بڑھاتی رہیں اور ان آگے پہنچ جانے والوں کے لئے خود ختم ہو جایا کریں۔ تا آنکہ کاروان انسانیت کو ان کی ضرورت باقی نہ رہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ دوا کا مقصود یہ نہیں ہوتا کہ انسان اسے ہمیشہ استعمال کرتا رہے، بلکہ اس کا وجود ہی اس لئے ہوتا ہے کہ وہ مریض کو صحت کے ایسے اسٹیج پر پہنچا دے کہ اس کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔ اس ضرورت کے ختم ہو جانے سے دوا کی افادیت خطرے میں نہیں پڑتی بلکہ یہی عین اس

کی کامیابی ہے۔ وہ مریض کو تندرست کرنے کے بعد خود الگ ہو جاتی اور کہیں محفوظ ہو کر اس لئے رکھی رہتی ہے کہ اگر کسی اور کو ویسا ہی مرض لاحق ہو تو پھر اس کے کام آجائے۔ یا بدقسمتی سے وہی پہلا شفا یافتہ اپنی بدپرہیزی سے پھر اسی اسٹیج پر آجائے جہاں وہ تندرستی سے پہلے تھا تو یہ دوا پھر اسے سہارا دے۔ دوا بنانے والا یہ نہیں چاہتا کہ وہ ضرور پھر بیمار ہوتا کہ اس دوا کی ضرورت یا افادی ابدیت خطرے میں نہ پڑ جائے۔ اس کا اصل مقصود یہی ہوتا ہے کہ مریض کسی طرح ایسا تندرست ہو جائے کہ اسے اس دوا کی پھر کبھی ضرورت ہی نہ پڑے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ تندرستی کا شمار اصل مرکزی اقدار میں ہے اور استعمال دوا ایک عارضی قدر ہے۔ بالکل یہی شکل قرآنی اقدار کی بھی ہے۔ اس کی ساری اقدار ایک ہی نوعیت کی ابدیت نہیں رکھتیں بلکہ کچھ غیر متبدل قدریں مقصدی اور مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی کامیابی یہی ہے کہ انسان کو اصلی اقدار تک پہنچا کر خود ختم ہو جائیں۔ یا جدید ضرورت پیدا ہونے تک کسی نہاں خانے میں محفوظ (RESERVE) رہیں۔ اس کی چند مثالیں سن لیجئے:

(1) نزول قرآن سے ہزاروں سال پہلے سے "غلامی" کا دستور چلا آرہا تھا۔ جہاں کسی کو بے بس پایا اسے خرید کر یا یوں ہی گرفتار کر کے غلام بنا لیا یا جنگ میں جو قیدی ہاتھ آئے انہیں غلاموں کی حیثیت سے فوجیوں میں تقسیم کر دیا۔ مرد غلام، عورتیں لونڈیاں اور ان کی اولاد غلام زادے۔ قرآن پاک میں آپ کو غلامی کے بہت سے احکام ملیں گے۔ مثلاً دشمن کا زور ٹوٹ جائے اور کسی نئے فتنے فساد کا اندیشہ نہ ہو تو غلاموں (قیدیوں) کو فدیہ لے کر یا بغیر فدیہ لئے چھوڑ دو۔ قسم توڑنے یا ظہار کرنے یا قتل خطا کے کفارے میں غلام آزاد کرو۔ اعلیٰ درجے کی نیکیاں حاصل کرنے کے لئے انسانی گردنوں کو غلامی کے پھندے سے آزاد کراؤ۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان احکام کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ قرآن رسم غلامی کی تصدیق (CONFIRM) کرتا ہے۔ بلکہ اصل حقیقت یوں ہے کہ قرآن دنیائے انسانیت کو ان اقدار کے ذریعے ایسے مقام شرف پر پہنچانا چاہتا ہے جہاں رسم غلامی نیست و نابود ہو جائے اور تمام اولاد آدم آزاد اور برابر کے بھائی بھائی بن جائیں، قانون کی نگاہ میں سب کے سب یکساں ہوں اور ضمیر کی حریت یکساں طور پر سب کے لئے باقی رہے۔ حتیٰ کہ وطنی اور غیر وطنی (عربی و عجمی)، اسود و احمر، شاہ و گدا، امیر و غریب، فاتح و مفتوح وغیرہ کے تمام امتیازات و فروق بھی ختم ہو جائیں۔ اگر درجات کا فرق رہے تو اس کی بنیاد صرف کردار (تقویٰ) ہو۔ گویا غلامی کے احکام قدر مستقل کا درجہ نہیں رکھتے بلکہ ایک اعلیٰ قدر تک لے جانے کے لئے فقط ذرائع و وسائل ہیں اور انسان کو منزل مقصود پر پہنچانے کے بعد خود ختم ہو جاتے ہیں۔